بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یہ محض فضلِ ربّی کا نتیجہ ہے کہ اُس نے ہم جیسے ناتواں اور تہی دست لوگوں کو بھارتی جارحیت کے موقع پر ملک اور کشمیر کے مظلوم بھائیوں کی خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ ان مخدوش حالات میں اپنے وسائل کی کمی کے باوجود جو تھوڑی سی خدمت جماعت اسلامی کے کارکن کر سکے ہیں اُس میں ہماری کوشش کو کوئی دخل نہیں، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی نوازش اور قوم کے مخلصانہ تعاون کی رہینِ منّت ہے۔ ہمیں اس حقیقت کے اظہار کی ضرورت کچھ اس وجہ سے پیش نہیں آئی کہ ہم خدانخواستہ اپنی خدمات سے لوگوں کو آشنا کرنے کے آرزومند ہیں، یا قوم اور ملک پر کوئی احسان جتلانا چاہتے ہیں، یا ان کے ذریعہ ملک اور بیرونِ ملک میں اپنی ساکھ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ علیم و خبیر ذات جس کے علم سے کوئی مادّی شئے تو کیا کوئی موہوم احساس تک پوشیدہ نہیں، ان جذبات کو اچھی طرح جانتا ہے جن کے تحت ہم نے اپنا یہ فرض اپنی حدِ وسع تک سرانجام دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے آج ان صفحات میں اس کا تذکرہ صرف اس غرض کے لیے کیا ہے کہ ہمارے رفقاء اور ہمارے کام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات، ان وسیع تر مقاصد کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جن کے حصول کے لئے ہم نے یہ سب کچھ کیا ہے یا آئندہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہمارے ہر رفیق اور ہمدرد و معاون کو یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جماعت

اسلامی محض خدمت خلق کا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس طرح کے دوسرے ادارے جو ملک میں کام کر رہے ہیں وہ مفید اور کارآمد نہیں ہیں۔ ہم اُن کی افادیت کے دل و جان سے قائل ہیں، اُن کی خدمات کے معترف ہیں اور اُن سے ہر مفید کام کے سلسلے میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ہم جو رفاہی کام کر رہے ہیں اُس کا مقصد محض معاشرتی خدمت نہیں، بلکہ ہمارے یہ سارے کام ہماری زندگی کے سب سے مقدم، سب سے بنیادی، سب سے ضروری اور سب سے اہم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اور وہ صرف ایک ہی ہے یعنی رضائے الٰہی۔ اس ایک مقصد کے علاوہ ہمارا کوئی دوسرا مقصد نہیں، اس ایک غایت کے علاوہ ہماری کوئی دوسری غایت نہیں، اس ایک آرزو کے علاوہ ہماری کوئی دوسری آرزو نہیں کہ ہمارا خالق و مالک ہم سے راضی ہو۔ اُسی ذاتِ بے ہمتا کی خوشنودی ہمارا مطلوب و مقصود ہے۔ اگرچہ ہم اپنی برادری، اپنے خاندان، اپنی ملت کے ہر فرد بلکہ نوعِ انسانی کے ہر رکن کو حتی المقدور خوش رکھنا چاہتے ہیں، اور کسی کی ناراضی مول نہیں لینا چاہتے، لیکن یہ سب کچھ اُس ذات کی خوشنودی کے تابع ہے جس کے قبضۂ قدرت میں ہماری جان ہے، جسے ہم نے پورے شعور اور پورے احساسِ ذمّہ داری کے ساتھ اپنا الٰہ، رب اور مالک تسلیم کیا ہے، اور جس کی خاطر ہم جینے اور مرنے کا عہد کر چکے ہیں۔ اگر ہمارے کسی کام سے پوری دنیا ہم سے خوش ہوتی ہو مگر مالک الملک کی ناراضی کا اس میں ذرہ برابر بھی خدشہ ہو تو وہ ہمارے لیے سراسر گھاٹے کا سودا ہے جسے ہم کرنے کے لیے جیتے جی کبھی تیار نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اگر کسی کام سے مالک الملک کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہو، خواہ اُس کے انجام دینے سے پوری دنیا ہمارے خون کی پیاسی ہو جائے، تو ہم پوری دنیا کے دباؤ اور دشمنی کو نظر انداز کر کے وہی کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس سے ہمیں اپنے مالک الملک کی رضامندی حاصل کرنے کی توقع ہو۔

ہم ملّتِ اسلامیہ کے افراد ہیں، اس بنا پر اس کے دکھ ہمارے دکھ ہیں اور اس کے سکھ ہمارے سکھ ہیں۔ جو اُفتاد بھی اُس پر پڑتی ہے اُس کی لپیٹ میں ہم بھی اُسی طرح آتے ہیں جس طرح کہ ہمارے

دوسرے بھائی آتے ہیں۔ اس ملت کے ایک ایک فرد سے ہمیں دینی تعلق کی بنا پر غیر معمولی محبت اور وابستگی ہے۔ اُس کی تکلیف سے ہمیں بے حد اذیت پہنچتی ہے اور ہم اُسے جلد از جلد دُور کرنے کے لیے مضطرب اور پریشان ہوتے ہیں۔

اسی طرح یہ ملک جس میں ہم رہتے ہیں یہ ہماری امیدوں کا مرکز ہے۔ اس سے ہمیں ایک جذباتی لگاؤ اور قلبی تعلق بھی ہے، اور اسی سرزمین میں ہم دینِ حق کا بول بالا کرنے کی بھی امید رکھتے ہیں جو ہماری تمام کوششوں کا اصل مقصود ہے۔ علاوہ بریں یہ ظاہر ہے کہ اس کی خوشحالی سے ہماری خوشحالی وابستہ ہے اور اس کی بربادی ہماری اپنی بربادی ہے۔ اگر یہ آزاد رہے تو ہم یہاں آزادی کا سانس لے سکیں گے اور خدانخواستہ یہ غلام بن گیا تو ہم دنیا میں ذلیل و خوار بن کر رہ جائیں گے۔ اس کی سربلندی سے ہماری عزت ہو گی اور اس کی رسوائی سے ہماری گردنیں شرم سے جھک جائیں گی۔ ہم فاترالعقل نہیں ہیں کہ ان حقائق کو جانتے بوجھتے اس ملک کے خیرخواہ نہ ہوں اور اس کی آزادی، خوشحالی اور ترقی کے لیے تن، من، دھن قربان کرنے سے دریغ کریں۔

ہمارے اس خطۂ پاک کے چند علاقے ابھی تک دشمن کے غاصبانہ قبضے میں ہیں۔ اس دشمن نے جو فکر و نظر کے اعتبار سے انتہائی متعصب، تنگ نظر، ———
اور جذبہ و احساس کے اعتبار سے انتہائی ظالم اور سفاک ہے، ان علاقوں کے باشندوں پر بے پناہ مظالم ڈھاتے ہیں۔ ایسے مظالم کو اگر درندگی کہا جائے تو خود درندے غضبناک ہو کر اپنی براءت کا اعلان کر دیں اور پورے زور کے ساتھ پکار اُٹھیں کہ ان ظالموں کو ہم سے تشبیہ دینا ہماری توہین ہے۔ جو لوگ ان کے مظالم کے شکار ہوئے ہیں ان کی دردناک حالت دیکھ کر ہمارے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ اُن کی بربادی کی داستانیں سُن کر ہمارا ذہنی سکون درہم برہم ہو جاتا ہے، اُن کی تباہی کے نقشے جب ہماری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں تو ہمارا خون کھول اٹھتا ہے اور ہم تڑپ کر رہ جاتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا ہم انسانی حس سے یکسر محروم ہو چکے ہیں؟ کیا ہمارے اندر کوئی غیرت نہیں رہی؟

کیا ہماری دینی حمیت کا جنازہ نکل چکا ہے؟ آخر ہم کب تک اس ظلم کے تماشائی بنے رہیں گے؟

اپنی ملت، اپنے وطن، ابنائے وطن اور مجبور و مظلوم بھائیوں کے بارے میں ہمارے یہ احساسات بالکل فطری ہیں۔ یہ تو اپنے بھائی بندوں اور اپنے ملک کا معاملہ ہے۔ ہم تو دنیا کے کسی کونے میں کسی شخص کو بھی دکھ اور مصیبت میں دیکھ نہیں سکتے۔ انسان تو کیا ہمیں تو جانوروں اور حیوانوں تک کی تکلیفات دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔ ہماری یہ دلی آرزو ہے کہ خدا کی مخلوق اُس کی زمین میں امن اور سکون کے ساتھ رہے۔ ظلم اپنی تمام صورتوں میں دنیا سے نیست و نابود ہو۔ انسان اور انسان کے درمیان محبت اور اخوت کے رشتے استوار رہیں۔

ممکن ہے اپنی قوم، اپنے ملک بلکہ بنی نوع انسان کے متعلق ہمارے یہ افکار سُن کر کوئی غیر مسلم بڑی معصومیت کے ساتھ کہہ دے کہ جناب یہ افکار و نظریات کوئی آپ کا امتیاز نہیں، یہ تو انسانیت کا مشترک سرمایہ ہیں۔ ہر انسان جو ذہنی اور جذباتی اعتبار سے صحت مند ہے ہمیشہ اپنی قوم، اپنے وطن اور نوعِ بشری کی بہتری کا آرزو مند ہوتا ہے۔ پھر آپ کو دنیا میں جو امتِ وسط کہا گیا ہے تو اُس کی امتیازی خصوصیت کیا ہے۔ یہ سوال بالکل جائز اور فطری سوال ہے، اور اسی سوال کے جواب میں اسلامی تعلیمات کی روح مضمر ہے اور یہی جماعت اسلامی کی دعوت کا نچوڑ ہے۔

ہم مسلمانوں کو بار بار جس چیز کی طرف توجہ دلا رہے ہیں اور پوری نوع بشری کو جو حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ انسان کا انسان کے ساتھ تعلق، انسان کا اپنی برادری اور خاندان کے ساتھ تعلق، انسان کا اپنے ملک اور اپنی قوم کے ساتھ تعلق، بلکہ انسان کا اس پوری کائنات کے ساتھ تعلق اُس وقت تک صحیح بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان کا اپنے خالق اور مالک کے ساتھ تعلق صحیح نہج پر استوار نہ ہو۔ عابد و معبود کے درمیان تعلق بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اور اسی کی اساس پر دوسرے تعلقات صحیح طور پر استوار کیے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ تعلق صحیح نہ ہو تو باقی

تعلقات خود بخود بگڑ جاتے ہیں، اور اگر یہ تعلق بالکل درست ہو تو پھر دوسرے تعلقات فطری طور پر بالکل صحیح رُخ اختیار کر لیتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ انسان اپنی قوم سے محبت کرنا چھوڑ دے یا اپنے ملک کی فلاح و بہبود کو نظر انداز کر دے یا انسانیت سے مُنہ موڑ لے۔ یہ سب رشتے بالکل فطری ہیں اور ہم ان کی اہمیت کے دل وجان سے قائل ہیں۔ اس بنا پر ان رشتوں کو توڑنے کے بجائے ہم انہیں زیادہ مستحکم بنانے کے آرزومند ہیں۔ مگر ہم یہ بات پُورے شعور، اور پُورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان رشتوں میں تقدیس، ان میں استحکام اور انہیں اپنے جائز فطری حدُود میں رکھنے کے لیے اوّلین شرط یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے اُس بنیادی رشتۂ عبودیت کو درست کرے جو خالقِ کائنات کے ساتھ اُس کا تعلق جوڑتا ہے۔ دوسرے رشتے سب اسی ایک رشتے کے تابع ہیں اور اُن کی درستی اور مضبوطی کا انحصار سراسر اسی ایک رشتے پر ہے۔

آپ اسی حقیقت کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک جرمن کو اپنے ملک جرمنی سے ایک انگریز کو اپنے وطن انگلستان سے، ایک بھارتی کو اپنے دیس بھارت سے اور ایک پاکستانی کو اپنے خطۂ پاک سے طبعی طور پر کتنا لگاؤ ہے۔ خاکِ وطن سے محبت انسانی فطرت کا تقاضا ہے جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس فطری احساس میں مسلم و غیر مسلم دونوں یکساں ہیں۔ اور کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ جرمن، انگریز، بھارتی اور پاکستانی ہر ایک اپنے وطن کو دنیا میں سربلند دیکھنا چاہتا ہے اور اُس کے حفظ و بقا اور فلاح و ترقی کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے پر آمادہ ہوتا ہے، جہاں تک وطن کی محبت کا تعلق ہے ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر آپ دیکھیے کہ خدا اور بندے کے درمیان بنیادی تعلق کے فرق کی وجہ سے مسلم و غیر مسلم کے اپنے اپنے وطن سے محبت کے انداز ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہوجاتے ہیں۔ ایک نازی چونکہ اپنے خدا کے ساتھ اپنے رشتے کو صحیح بنیادوں پر استوار نہ کرسکا اس لیے وطن کے ساتھ اُس کی فطری محبت نے اپنے جائز حدُود سے تجاوز کرکے ایک خوفناک عذاب کی صورت اختیار کرلی۔ اُس نے جب خدا کی حاکمیت

کا انکار کیا تو پھر اُس کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر خدا مقتدرِ اعلیٰ نہیں ہے تو پھر وہ کس چیز کو اپنا معبود بنائے۔ اس ذہنی اور جذباتی خلا کو اُس نے وطن کی محبت سے پُورا کرنا چاہا اور ملک اور قوم کو مالک الملک کے مقام پر رکھ کر اُس کی پرستش شروع کر دی۔ اس بنیادی غلطی سے فکر و نگاہ کے سارے زاویے بدل کر رہ گئے۔ چنانچہ جرمنوں کے ذہن میں سب سے پہلے یہ باطل خیال جاگزیں ہُوا کہ جو قوم جرمنی جیسے طاقتور "الٰہ" کی پرستار ہے، اُسی کو پُوری دنیا کی حکمرانی اور فرمانروائی کا حق حاصل ہے۔ اسی وطن پرستی نے بڑی تیزی کے ساتھ نسل پرستی اور قوم پرستی کی صورت اختیار کر لی۔

اب جبکہ وطن، نسل اور قوم، اہلِ جرمن کے الٰہ اور معبود قرار پائے تو خیر و شر کے پیمانے بھی بدلنے لگے۔ اب حق وہ چیز ٹھہری جس سے جرمن قوم اور جرمنی کو فائدہ حاصل ہو اور باطل وہ چیز قرار پائی جس سے اہلِ جرمن کو نقصان پہنچے۔ دوسرے لفظوں میں حق صرف جرمنی کے گرد گھومنے لگا۔ اس غلط طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہُوا کہ حق و باطل کے وہ معروضی معیار (OBJECTIVE STANDARDS) جن کی وجہ سے انسانیت کے مختلف طبقات کے درمیان عدل و انصاف قائم ہے، یکسر ختم ہو گئے اور ایک قوم نسل پرستی اور وطن پرستی کے جنون میں گرفتار ہو کر آس پاس کی کمزور اقوام پر پل پڑی اور اس نے نہ صرف پُوری دنیا کے امن کو غارت کر کے رکھ دیا، بلکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں پر وہ ظلم ڈھائے جن کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

دُور نہ جائیے ذرا بھارت کے حالات پر غور کیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری چیز کو الٰہ بنانے کے کتنے بھیانک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایک قوم جو پوری دنیا کے سامنے امن کی دعویدار ہے، جو اپنے آپ کو اہنسا کا علمبردار کہتی ہے، وہ کشمیر کی بے بس مسلم آبادی پر کیسے خوفناک مظالم ڈھا رہی ہے۔ اُس کے قول و فعل میں اس شرمناک تضاد کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ اُس نے اپنے معبودِ حقیقی کو چھوڑ کر اپنے وطن اور اپنی قومیت کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔ اُس کی اس مجرمانہ روش کی اللہ تعالیٰ نے اُسے یہ سزا دی ہے کہ اُس کے دل و دماغ سے حق و باطل کا امتیاز

بالکل مٹ گیا ہے۔ اس کے نزدیک جب معبود صرف وطن ہے تو اُس کے لیے ہر قسم کا جھوٹ، ہر قسم کا مکر و فریب اور ہر قسم کا ظلم و جور بالکل جائز ہے۔ اس جھوٹے معبود نے قدم قدم پر اُسے بہکایا اور اس سے ایسے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کروایا جو انسان تو کیا جانوروں تک کو زیب نہیں دیتے۔ جس اصول پر ملک تقسیم ہوا اور جس اصول پر ریاستوں کے الحاق کا فیصلہ کیا گیا اور جس اصول کے تحت خود بھارت نے بعض ریاستوں کو بالجبر اپنے ساتھ شامل کر لیا، اس کے مطابق کشمیر آپ سے آپ پاکستان کا جائز حصّہ قرار پاتا ہے۔ لیکن وطن کے جھوٹے الٰہ کی حد سے بڑھی ہوئی حرص کو پورا کرنے کے لیے اہلِ بھارت نے ہر قسم کے اخلاقی تقاضوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے شروع میں اپنے ہمسائے کے حصّہ پر بالکل ناجائز قبضہ کر لیا۔ پھر جب پاکستان نے اس پر شدید احتجاج کیا اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس وقت اس غاصبانہ تسلّط کو زیادہ دیر قائم نہیں رکھا جا سکتا تو دیانتداری اور حسنِ نیت سے نہیں، بلکہ مکاری اور فسادیت کے ساتھ پوری دنیا کو گواہ بنا کر یہ وعدہ کیا کہ ہمارا یہ قبضہ بالکل عارضی ہے۔ اس ریاست کے مستقبل کا فیصلہ اس کے باشندے ہی کر سکیں گے۔ اپنے اس اعلان کو وہ بار بار دہراتے رہے اور اقوامِ متحدہ میں بھی پوری دنیا کی قوموں کے سامنے انہوں نے اپنے اس قول کا کئی بار اعادہ کیا۔ لیکن آج اس کے لیڈر اپنے قول و قرار اور اپنے وعدوں سے یکسر منحرف ہو کر اور پوری طرح بے شرم بن کر یہ کہہ رہے ہیں کہ کشمیر بھارت کا غیر منفک حصّہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا بھارتی قوم یہ سب کچھ غفلت اور بے شعوری کے عالم میں کر رہی ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ اس قوم کا بچہ بچہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ کشمیر پر بھارت کا کوئی حق نہیں۔ اُن کا ایک ایک فرد اس بات کو پوری طرح جانتا ہے کہ کشمیر مسلم اکثریت کا علاقہ ہے اور لامحالہ اسے پاکستان کے ہی ساتھ شامل ہونا چاہیے۔ ان کا ضمیر جانتا ہے کہ وہ اس مظلوم خطے کو بھارت کے ساتھ بالجبر ملحق رکھنے کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں، وہ سراسر بددیانتی، بداخلاقی اور ہٹ دھرمی ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ کیا وہ نوعِ انسانی کے افراد نہیں۔ اس کا جواب وہی ہے جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ وطن کے جھوٹے

الہ کے پرستار بن کروہ انسانیت کے جوہر سے یکسر محروم ہو چکے ہیں، اُن کی نگاہوں پر تنگ نظری اور تعصب کی پٹیاں بندھ چکی ہیں اور اُن کے دل شرافت اور نیکی کے پاکیزہ جذبات سے بالکل عاری ہو گئے ہیں جس الہ کی انہوں نے بندگی اختیار کی ہے۔ اُس نے اُن کے ذہن میں یہ بات ڈال دی ہے کہ ہر وہ فعل جائز اور برحق ہے جسے اس الہ کے لیے مفید خیال کیا جائے چونکہ کشمیر پر قبضے سے اس الہ کا دائرہ اختیار وسیع ہوتا ہے اس لیے یہ تسلط خواہ اخلاقی اعتبار سے کتنا ہی ناجائز ہو مگر بھارت والوں کے لیے یہ انتہائی ناگزیر ہے۔ اس بنا پر وہ صرف جان و مال ہی کو اس پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ حق، انصاف نیکی، شرافت، انسانیت، ہر چیز کو اس کی بھینٹ چڑھانے کے لیے آمادہ ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ اُن کے اس غاصبانہ اور غیر اخلاقی طرزِ عمل سے اُن کی قومی ساکھ کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے اور خود ان کے اپنے ملک کے اندر اُن کی یہ ناعاقبت اندیشانہ روش اُن کے لیے کتنے مصائب اور پیچیدگیاں پیدا کر رہی ہے۔ انہیں اپنے ظالمانہ افعال کے بُرے نتائج سے کوئی سروکار نہیں، انہیں تو صرف اپنے معبودِ باطل کی خوشنودی مطلوب ہے اور اس ایک مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنی ہر متاع قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔

بھارت کے اس غیر معمولی طرزِ عمل سے ہٹ کر دنیا پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ جھوٹے خداؤں کی پرستش سے اس کرۂ ارضی پر حق و انصاف کا کتنا خون ہو رہا ہے۔ پُوری دنیا جانتی ہے کہ کشمیر میں ہندوستان جو کچھ کر رہا ہے وہ سراسر غلط اور ناانصافی ہے۔ اقوامِ متحدہ جسے دنیا میں امن و امان اور قوموں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے کا دعویٰ ہے، اُس میں دنیا کی قریب قریب ساری قوموں کے نمائندوں کے سامنے یہ بات نہایت واضح طور پر طے کی گئی کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام کے ہاتھ میں ہے اور وہ استصواب رائے سے اپنی ریاست کے الحاق کا تصفیہ کریں گے۔ لیکن عمل کی دنیا میں جو کچھ ہوا یا آج ہو رہا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ درندے بھی اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے کوئی ضابطۂ اخلاق رکھتے ہیں مگر آج ان بڑی قوموں کے سامنے کوئی ضابطۂ اخلاق نہیں۔ چور، ڈاکو، رہزن اور

لٹیرے بھی اپنے معاملات کسی اصول کے تحت طے کرتے ہیں، مگر تہذیب کے ان علمبرداروں کا کوئی اصول نہیں کشمیر کے بارے میں جو اصول خود ان بڑی قوموں نے وضع کیا اسی اصول کی ان کے ہاتھوں برسوں سے مٹی پلید ہو رہی ہے۔ پہلے تو بھارت کی ناراضی کے خوف سے اس کی پابندی کروانے میں مجرمانہ تغافل سے کام لیا گیا۔ اور اپنے کیے ہوئے فیصلے کے نفاذ میں جان بوجھ کر تاخیر کی گئی۔ پھر اس کے عمل درآمد کی اگر کبھی نوبت بھی آنے لگی تو ایک بڑی طاقت نے جو بزعمِ خویش اپنے آپ کو سامراج اور سامراجی عزائم کی سب سے بڑی دشمن سمجھتی ہے، حق و انصاف کے سارے تقاضوں کو نظر انداز کر کے بار بار سلامتی کونسل میں ویٹو استعمال کیا اور بڑے شرمناک طریقے سے اس مسئلہ کو کھٹائی میں ڈلوا دیا۔ اس کے بعد اب بھارت اپنے ہر وعدے سے کھلم کھلا منحرف ہو رہا ہے، اور پوری دنیا کے سامنے ایک ایسا ظالمانہ سامراجی طرزِ عمل اختیار کر رہا ہے جس کی اخلاق اور دیانت کوئی بھی تائید نہیں کرتے، مگر دنیا کی بڑی قومیں اُس کی ان ساری غیر اخلاقی حرکات کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس کی حمایت پر کمر بستہ ہیں اور ظالم کو اس کے مظالم کی سزا دلوانے کی بجائے اُلٹا مظلوموں کو مطعون کر رہی ہیں۔ اپنے قومی مفادات کی محبت نے اُن کے قلب و دماغ سے حق اور انصاف کا ہر تصور مٹا دیا ہے اور انہیں کچھ یاد نہیں رہا کہ انہوں نے خود کشمیر کے بے کسوں سے کیا وعدے کیے تھے۔

اُن کے دلوں میں اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس کیوں ختم ہو گیا ہے؟ اُن کے ذہنوں نے انصاف اور انسانیت کے نقطۂ نظر سے سوچنا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ ان کے ضمیر آخر کیوں مردہ ہو گئے ہیں؟ اور اُن کی انسانیت کی اس بدنصیبی کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ان قوموں نے کائنات کے مالک کو اپنا الٰہ مان کر اُس کے دیئے ہوئے احکام کی پیروی کرنے کے بجائے اپنی قومیت اور اپنے وطن کو الٰہ بنا لیا ہے۔ اس بنا پر اُس کے مفادات اُن کے نزدیک دنیا کی ہر شے سے عزیز تر ہیں۔ عدل و انصاف، شرافت، اخلاق، قول و قرار کا پاس، سب معبودِ وطن کے مادی مفادات کے تابع ہیں اور چونکہ بھارت پاکستان کے مقابلے میں اُن قوموں کے سامراجی عزائم کی بہتر تکمیل کر سکتا ہے، اس لیے

یہ اس کی صریح بددیانتی اور ظلم و زیادتی کے باوجود اس کے مقابلہ میں پاکستان کی تائید کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہیں۔

عدل و انصاف سوائے رب العالمین کی عدالت کے اور کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے؟ حق و باطل کے درمیان امتیاز بجز اُس کی نازل کردہ فرقان کے اور کس کسوٹی سے ہو سکتا ہے؟ اس ایک نورِ مبین کے سوا اور کون سی روشنی ہے جو انسان کو گمراہیوں اور ضلالتوں سے بچا کر کامیابی کے مقام تک لے جاتی ہے؟ باری تعالیٰ کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم کے سوا اور کون ایسی راہ ہے جس پر چل کر انسان دنیا اور آخرت میں فائز المرام ہو سکے؟ خالق کی ہدایت کے سوا اور کس کی ہدایت انسانیت کی فوز و فلاح کی ضامن ہو سکتی ہے؟ انسان خواہ کتنا ہی نیک نیت اور راستباز ہو، خواہ کتنا ہی صاحبِ بصیرت اور صاحبِ عقل ہو، خواہ کتنا ہی عاقبت اندیش اور صاحبِ تدبّر ہو، خواہ کتنا ہی انصاف پسند اور عادل ہو، بہرحال انسان ہے اور انسان ہونے کی حیثیت سے وہ بشریت کی فطری حدود و قیود اور اس کے فطری تقاضوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ وہ دنیا میں کچھ جبلتوں کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے۔ اُسے شروع ہی سے کچھ ضروریات لاحق ہوتی ہیں۔ وہ ایک خاص آغوش، ایک خاص ماحول اور ایک مخصوص معاشرے میں پرورش پاتا ہے جو اُس کے طرزِ فکر اور اُس کے احساسات و جذبات کی ایک خاص انداز پر صورت گری کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اُس کے اندر ایک خاص نوعیت کی خواہشیں اور آرزوئیں جنم لیتی ہیں، اُس کے اندر ایک مخصوص رُجحان اور میلان پرورش پاتا ہے، اُس کے ذہن میں ایک خاص طرز کے تعصبات اُبھرتے ہیں جو اُس کے فکر و نظر کو بالکل قدرتی طور پر غیر متوازن بنا دیتے ہیں۔ وہ بیچارا دنیا کے ہر مسئلہ کو اپنی شخصیت کی عینک سے دیکھنے کے لیے مجبور ہے ایک انسان جو اپنے ذاتی احساسات و رجحانات کے ہاتھوں بے بس ہو اور جس کی نگاہ اپنی حیات کے خم و پیچ میں اُلجھ کر رہ گئی ہو، وہ انسانیت کے وسیع تر مفادات کے متعلق آخر کس طرح سوچ سکتا ہے۔ اُس کا طرزِ فکر لازمی طور پر محدود اور اس کا زاویۂ نگاہ فطری طور پر غیر متوازن ہوگا۔ اُس کے

قلب و دماغ کے ہر گوشے پر اُس کے ذاتی رجحانات، اُس کے خاندانی اور نسلی تعصبات، اُس کے ملکی اور قومی مفادات کی پرچھائیاں پڑیں گی جن سے حقائق اُس کے سامنے ایک مخصوص رنگ میں آئیں گے جب تک انسان اپنی شخصیت کے بنے ہوئے تانے بانے کو خود اپنے ہاتھوں سے تار تار نہ کر دے اس وقت تک اُس کی کوئی رائے بھی سو فیصد غیر جانبدارانہ اور حق و انصاف پر مبنی نہیں ہو سکتی اور یہ چیز بالکل ناممکنات میں سے ہے۔ انسان اپنی شخصیت کے اثرات سے خواہ اپنے آپ کو کتنا ہی بچانے کی کوشش کرے وہ بہر حال اس کے پرتو سے اپنے آپ کو یکسر محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے اُس کی آراء، اس کے افکار و نظریات، اُس کے احساسات و جذبات، اُس کے ذاتی میلان و رجحان کے مختلف عکس ہوتے ہیں۔ آخر یہ بات کسی انسان کیلئے کس طرح ممکن ہے کہ وہ دنیا میں ایک خاص طرزِ فکر اور خاص جذبہ و احساس کے ساتھ زندہ ہو مگر اس طرزِ فکر اور اس جذبۂ احساس کی جن عوامل نے تشکیل کی ہے ان کے اثرات سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھ سکے۔ اُس کی خاندانی اور نسلی خصوصیات اس کی سیرت کی تعمیر کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ ماحول کے تقاضے اس بنیاد پر کردار کی مضبوط عمارت اٹھاتے ہیں۔ زندگی کے تلخ و شیریں تجربات جو اسے اپنے ماحول کی تجربہ گاہ سے حاصل ہوتے ہیں اس کے کردار کی عمارت کو مختلف رنگوں سے مزیّن کرتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کی اسی عمارت میں، جس کے کچھ حصّوں کی تعمیر اُس کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور کچھ حصّے اُسے جُوں کے توں دوسروں سے منتقل ہو جاتے ہیں، زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اس سے اُسے کسی طرح بھی مفر نہیں۔ وہ اپنے آپ کو اُن اثرات سے جو اُس کے خون میں سرایت کیے ہوتے ہیں کسی طرح بھی بچا نہیں سکتا۔ وہ اپنے قلب و نگاہ کو خواہش اور تمنّا کے باوجود اس ماحول کی پرچھائیوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا جس کی آغوش میں اُس نے پرورش پائی ہے۔ اس بنا پر اس کی رائے، اس کے ذاتی رجحانات اور تعصبات کی آمیزش سے کبھی خالی نہیں ہو سکتی۔ وہ جب کبھی سوچے گا اپنے ذاتی، قومی اور ملکی مفادات کو سامنے رکھ کر سوچے گا۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کے جانبدارانہ طرزِ فکر میں وہ بے لوثی کبھی نہیں آ سکتی جو حق و صداقت کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کر سکے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان حیران و ششدر ہو کر پوچھتا ہے کہ وہ حق کو کہاں سے حاصل کرے۔ اس کا جواب بالکل سیدھا اور واضح ہے کہ یہ حق اُسی ذات بے ہمتا سے مل سکتا ہے جو زمان و مکان کی حدود و قیود سے یکسر آزاد ہے، جو کسی خاص ماحول یا عہد کی پیداوار نہیں، بلکہ یہ ماحول اور عہد اور یہ زمان و مکان اپنے وجود کے لیے سراسر اُس ذات کے رہینِ منّت ہیں جو ازلی اور ابدی اور قائم بالذات ہے، جسے نہ کسی نے جنم دے کر اپنی نسلی خصوصیات اُس کی طرف منتقل کی ہیں اور نہ خود اس نے کسی دوسرے کو جنم دے کر اپنی الوہیت کا وارث بنایا ہے۔ بے لاگ ذات اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی اس لیے حق کا واحد سرچشمہ صرف باری تعالیٰ ہے اور انسان خالص امرِ حق صرف اسی وقت پا سکتا ہے جب وہ اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو کر اُس ہدایت کی پابندی قبول کرے جو باری تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے۔

پھر اسی معاملہ کو ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھیے۔ انسان اگر اپنے لیے کوئی صحیح اور مکمل ضابطۂ اخلاق مرتب کر سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ وہ اپنی زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کو پُوری طرح جاننے اور سمجھنے میں کامیاب ہو چکا ہو۔ کیا عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ جو چیز خود نہایت ہی پیچیدہ مخلوق ہو اور جس کی نگاہوں سے اُس کی اپنی ذات کے ہزارہا پہلو مخفی اور پوشیدہ ہوں وہ اپنی پوری شخصیت کا اچھی طرح ادراک کیے بغیر اپنے لیے کوئی متوازن ضابطۂ حیات تشکیل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ انسان چند دھاتوں کا مجموعہ ہی نہیں، جن کا تجزیہ کر کے ان کی ترتیب کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ کیا جا سکے۔ وہ شعور، آگہی، جذبہ و احساس اور نہ جانے کتنی غیر مرئی صفات کا حامل ہے۔ انسان ابھی تک اپنے شعور کی وسعتوں کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا۔ لاشعور کا ایک بحرِ بیکراں جو اُس کی شخصیت پر ہر لحظہ اثر انداز ہوتا ہے وہ اُس کی نظروں سے قریب قریب اوجھل ہے۔ اس کی نگاہوں نے اگر شعور کی یخ بستہ چٹانوں کو چیر کر کبھی لاشعور کے متلاطم خیز سمندر تک پہنچنے کی کوشش کی بھی تو وہ صرف اس کی سطح پر چند بکھری ہوئی اور منتشر لہروں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔ اور

اس سمندر کی اُن انتھاہ گہرائیوں کا اندازہ کرنے میں یکسر ناکام رہیں جس کی تند و تیز رویں اور بلاخیز موجیں ہمارے سفینۂ حیات کو ہمیشہ متزلزل رکھتی ہیں۔ یہ تو صرف شعور اور لاشعور کا معاملہ ہے۔ حیاتِ انسانی کے ہزاروں نہیں لاکھوں گوشے اسی طرح انسانی عقل و فکر کی رسائی سے ماوراء ہیں۔ بالفرض اگر کبھی انسان شعور اور لاشعور کا ادراک کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو پھر بھی اس کے لیے کسی صحیح ضابطۂ حیات کی ترتیب ممکن نہ ہو گی۔ پھر اُس کے لیے یہ سوال درپیش ہو گا کہ وہ ان کے درمیان کس انداز سے تطابق و توافق پیدا کرے کہ اُس کی زندگی روحانی، عقلی اور جذباتی اعتبار سے نہ صرف متوازن اور ہم آہنگ ہو بلکہ ہر لحاظ سے مکمل بھی ہو۔ اس ذمہ داری کو عقل تو بہر حال اٹھانے سے قاصر ہے۔ عقل تجربات کے بل بوتے پر آگے بڑھتی ہے۔ تجربات کا میدان صرف مادی دنیا ہی ہے۔ ان کی مدد سے ہم اُن اخلاقی اور روحانی عناصر کا صحیح کھوج نہیں لگا سکتے جن کے بغیر ہماری زندگی کائنات کی وسعتوں میں یکسر بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خبیر و علیم ذات ہی ہے جو ہماری زندگی کے ہر گوشے پر پوری پوری نگاہ رکھتی ہے، جو اُس کی نوعیت کو اچھی طرح جانتی ہے اور اُس کے تقاضوں کو بالکل ٹھیک طور سے سمجھتی ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان تعلق، انسان اور کائنات کے درمیان تعلق اور انسان اور اُس کے خالق کے درمیان تعلق کی صحیح انداز پر تشکیل وہی کر سکتی ہے۔ جس طرح ایک مشین ساز ہی اپنی مشین کے سارے پرزوں کی ماہیت اور اُن کی صحیح کارکردگی کو اچھی طرح جانتا ہے، اسی طرح کائنات کا خالق ہی اس بات کا صحیح فیصلہ کر سکتا ہے کہ اُس کی مخلوق اس دنیا میں کس انداز سے زندگی بسر کرے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ : خبردار! اُس کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔

یعنی خدا صرف ہمارا خالق اور مالک ہی نہیں بلکہ ہمارا حکمراں اور قانون ساز بھی ہے۔ اس نے جہاں ہماری تخلیق کا انتظام فرمایا ہے وہاں ہمیں اس ضابطۂ حیات سے بھی نوازا ہے جس کے مطابق ہم دنیا میں حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا کر کے دنیا اور آخرت میں کامیاب

کامران ہو سکیں یہ مخلوق کی انتہائی احسان فراموشی بلکہ ضلالت اور ہلاکت ہے کہ وہ اپنے وجود کے لیے تو اللہ تعالیٰ کے دستِ کرم کی رہین منت ہو مگر عمل کے میدان میں اس کے عطا کردہ ضابطۂ حیات سے صرفِ نظر کر کے اپنے اوہامِ باطل کی پیروی شروع کر دے۔

یہ ہے جماعت اسلامی کا اصل پیغام اور اس کی دعوت کا صحیح خلاصہ۔ یہ بات ہم کچھ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے۔ یہ وہ بدیہی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے بار بار انسانوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ یہ وہ دعوت ہے جسے پھیلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے اور کتابیں نازل کیں۔ یہ وہ پیغام ہے جسے سننے کی معبودانِ باطل کبھی تاب نہیں لا سکے۔ یہ وہ نعرۂ حق ہے جس کے بلند ہوتے ہی کفر کے ایوانوں میں زلزلہ آجاتا ہے۔ کفر و الحاد خواہ اس پر کتنا ہی برہم ہو مگر انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ انسان اپنے خالق اور مالک کو پہچان کر اس کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرے۔ وہ ضابطہ جو ہر عیب سے پاک اور ہر قسم کی افراط و تفریط سے محفوظ ہے۔

جماعت اسلامی پاکستان کی نئی مجلسِ شوریٰ کا جو پہلا اجتماع دسمبر کے دوسرے ہفتے لاہور میں منعقد ہوا اُس میں جو مختلف قرار دادیں منظور کی گئیں وہ ملک کی تازہ صورتِ حال کے تجزیہ، سیاسی سماجی اور دینی تنظیموں کی نازک ذمہ داریوں اور حکومت کے لائحۂ عمل کو صحیح رُخ پر متعین کرنے کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ہم ان صفحات میں ساری قرار دادوں پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف ایک قرار داد کو اُس کی غیر معمولی اہمیت اور حکومت کو اس نازک اور اہم مسئلہ پر فوری طور پر متوجہ کرنے کے لیے اُسے یہاں درج کرتے ہیں:

"حال میں حکومت کی طرف سے حج کے بارے میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان کی رائے میں وہ نہایت نامناسب ہے اور اس پر فوراً نظرِ ثانی کی جانی چاہیے۔ پچھلی جنگ میں اللہ تعالیٰ نے ہماری قوم پر جو فضل و کرم فرمایا ہے اس کا یہ کوئی صحیح شکر نہیں کہ اسی سال ہم ایک عظیم دینی فریضے